حضرت مولانا مفتی محمد اسحٰق صدیقی (کراچی)

سیاست کے غیر اسلامی نظریات

غیر اسلامی ریاست کی تاریخ اسلامی مملکت اور غیر اسلامی مملکت کا اختلاف جس طرح دونوں کی روح اور شکل میں ہے اسی طرح دونوں کی تاریخ میں بھی ہے۔ اسلامی ریاست کی ابتداء تو نوع انسانی کی ابتدا کے ساتھ ہوئی مگر غیر اسلامی ریاست کی ابتدا اس کے بہت بعد ہوئی۔ ابوالبشر حضرت آدمؑ علیہ السلام اولین خلیفۃ اللہ فی الارض ہیں مگر اس زمانہ میں غیر اسلامی ریاست کا تصور بھی کسی کے ذہن میں نہیں پیدا ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ جب افراد انسانی کی کثرت ہوئی اور بہت سے افراد حضرت آدمؑ کے فیوض صحبت سے دور ہو کر حیوانی ماحول میں جاکر نفس اور وساوس شیطانی سے مغلوب ہوئے تو اللہ رب العالمین سے بغاوت اور اس کے احکام سے سرتابی اپنے نفس کی اتباع اور اپنی حکومت و فرمانروائی کا تصور پیدا ہوا۔ تعلیمات الٰہیہ سے کان بند کرنے کے بعد طبعاً ان کی نظر کائنات پر اسلامی اور انسانی زاویہ کے بجائے حیوانی زاویہ سے پڑنے لگی اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ ہماری ملک ہے اس میں جس نوع کا تصرف ہم چاہیں کریں کسی طاقت کو یہ حق حاصل نہیں کہ ہمارے تصرفات کے لئے کوئی قانون مقرر کرے۔ ہماری مرضی اور خواہش ہی اس کا قانون ہے۔ غیر اسلامی ریاست کی ابتدا اسی تصور سے ہوتی ہے۔

مگر انسان کو اپنی کمزوری خود محسوس ہوتی تھی اور وہ باوجود کوشش اس فطری تصور کو اپنے ذہن سے کلیتہً محو کر دینے پر قادر نہ تھا کہ اقتدار اعلیٰ اس کے لئے نہیں ہے اس لئے وہ کبھی اقتدار اعلیٰ کو پہاڑوں اور دریاؤں کے لئے ثابت کرتا تھا اور کبھی چاند سورج اور ستاروں کے لئے حق تعالیٰ سے اقتدار اعلیٰ کی نفی کرنے کے بعد اس نے یہ تحفہ کائنات کے ذرے ذرے کے آگے پیش کیا۔ لیکن جس قدر اس کی عقل ترقی کرتی گئی اسے محسوس ہوتا گیا کہ اس کے اس تحفہ کو کوئی بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں اور کائنات کا کوئی فرد اس کے لائق ہے۔ آخر کار اس نے پھر اس

چیز کو اپنے نفس کے سامنے پیش کیا مگر اس کا نفس بھی اس بار کے اٹھانے سے ابا کرتا نظر آیا اب تک وہ اس کشمکش میں مبتلا ہے کہ اقتدار اعلیٰ کس کے لئے ثابت کرے۔ موجودہ دور اسی کشمکش کا دور ہے جس میں انسان و انسانیت کے لئے امن و امان ایک ایسا خواب بن گیا ہے جس کی تعبیر محال نظر آتی ہے۔

غیر اللہ کی فرمانروائی و حاکمیت کا نظریہ سب غیر اسلامی سیاسی نظریات کا بنیادی تصور اور سب میں قدر مشترک ہے۔ یہ مختلف زمانوں میں مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہوتا رہا۔ لیکن اس کی حقیقی صورت اتباع نفس اور طبعی خواہشوں کی حاکمیت کا اقرار تھی جو آج بھی موجود ہے اس میں وسعت اور پھیلاؤ زیادہ ہوتا گیا لیکن اصل شے میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ اتباع نفس کا تصور ایک ایسا تصور ہے کہ جو عقلی منہاج پر پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ صرف طبعی اور حیوانی نہج و طریق سے پیدا ہوتا ہے اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ غیر اسلامی ریاست و حکومت کا نشو و ارتقاء عقلی اصول پر نہیں ہوا بلکہ خالصتاً طبعی اصول و قوانین پر ہوا ہے۔ بخلاف اس کے اسلامی ریاست کا ارتقاء خالص عقلی بنیادوں پر اور عقلیت کے ارتقاء کے دوش بدوش ہوا ہے جس طرح متعفن اشیا میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں جس طرح تیز و تند ہواؤں کے چلنے سے ریگ کے تودے کھڑے ہو جاتے ہیں جس طرح بکریوں اور بھیڑوں کے گلے بن جاتے ہیں بالکل انہیں طبعی اصول پر غیر اسلامی ریاست کی بنیاد بھی پڑی۔ خواہشوں کی فراوانی دشمنوں کا خوف، اعانت و امداد باہمی کی حاجت نے مل کر پہلے خاندان یعنی سب سے چھوٹی ریاست کی بنیاد رکھی۔ پھر احتیاج میں زیادتی تعاون کے حدود بھی وسیع کرتی گئی اور قبیلہ کا وجود ہوا یعنی ریاست نے ارتقا کی جانب پہلا قدم بڑھایا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ غیر اسلامی ریاست کی موجودہ شکلیں ظہور پذیر ہوئیں۔ اس امر پر سب فلاسفہ کا اتفاق ہے کہ ریاست کی بنیاد افراد کی باہمی احتیاجات پر قائم ہے جو خواہشوں اور جذبات کی زہین منت ہیں یعنی غیر اسلامی مملکت کا عقلی اساس کے بجائے حیوانی طبعی اور جذباتی اساس پر مبنی ہونا ان سب لوگوں کو تسلیم ہے نظریۂ ارتقاء نے اس خیال کو اور بھی تقویت دی اور اس کی تشریح میں مملکت کے ارتقاء کو جسم فانی کے طبعی ارتقاء کے بالکل مشابہہ اور مماثل ثابت کیا گیا۔ روسو نے اس پر اتنا اضافہ کیا کہ گو مملکت کا وجود حاجت

وضرورت ہی کا رہین منت ہے مگر اس چیز نے ریاست کی شکل نہیں بتائی ہے بلکہ اس کی ضرورت پیدا کی ہے اس کی شکل کے وجود کا سبب ایک معاشری معاہدہ (SOCIAL CONTRACT) ہے جو غیر قولی صورت میں طبعی طور پر فرمانروا اور رعایا کے درمیان ہو جاتا ہے اور جس کی رو سے فرمانروا کو بعض حقوق مل جاتے ہیں اور بعض ذمہ داریاں اس پر ڈال دی جاتی ہیں۔ روسو کے مابعد زمانہ میں اس کے اس نظریہ نے خاصی مقبولیت حاصل کی اور موجودہ جمہوریت کی بنیاد بھی درحقیقت اسی نظریہ سے پڑی ہے۔ روسو جس کا بانی سمجھا جاتا ہے[1]۔

مارکس نے اس چیز کو واضح کر دیا کہ ریاست کی بنیاد طبعی طور پر معاشی ضروریات پر قائم ہے اور درحقیقت ریاست کے کل امور کا محور معاشیات کو ہونا چاہیئے۔ یہ درحقیقت مارکس کی کوئی جدت طرازی نہ تھی بلکہ جہاں تک غیر اسلامی ریاستوں کا تعلق ہے واقعات کی ترجمانی تھی۔ اس کے اس نظریہ نے ریاست کے تصور میں بھی ایک انقلاب پیدا کیا اور سیاسی جمہوریت کو معاشی جمہوریت کے ساتھ آمیز کر کے اشتراکی ریاست کی بنا ڈالی۔

موجودہ سیاسی نظریات | اسلامی مملکت اور غیر اسلامی مملکت کا یہ تاریخی اختلاف اس چیز کو واضح کر رہا ہے کہ دونوں میں کسی مقام پر موافقت و اتحاد ہونا غیر ممکن ہے۔ دونوں کی رو سے جدا دونوں کے اساسی تصورات جدا، دونوں کی شکلیں اور سورتیں جدا، پھر ان میں اتحاد کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟ اسلامی ریاست اور خلافت الٰہیہ کا اساسی تصور یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ اور فرمانروائی محض اللہ کے لئے ثابت ہے اور کسی غیر اللہ کے لئے ثابت نہیں۔

---

[1] دراصل روسو کا یہ خیال اس وقت کے نفسیاتی ماحول کا اثر تھا۔ اسلام نے قیام حکومت کا طریقہ معاہدہ رعیت کو مقرر کیا ہے۔ اس اعلیٰ طریق کے اعلیٰ اثرات کا اس نے مشاہدہ کیا۔ نیز اس امر کا مشاہدہ کیا کہ اسلام کے اعلیٰ طرز حکومت کی خوبی کا اعتراف عیسائی دنیا بھی کر رہی ہے۔ ان چیزوں نے اس کو اس اسلامی خیال کے سرقہ ناقص پر آمادہ کیا۔ وہ بیعت کا مکمل تصور تو ذہن میں رکھ نہ سکا لیکن اس کا ناقص تصور لے اڑا اور اس کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یورپ کی حیوانی دنیا میں اس ناقص تصور کو بھی غنیمت سمجھا گیا اور ایک عجیب و غریب شے سمجھ کر بہت زیادہ قبول کیا گیا۔ لیکن ناقص بہر حال ناقص ہے۔ اس سے فوائد سے زیادہ نقصانات پہنچے۔ روسو کے اس نظریہ میں کوئی جدت نہیں ہے لیکن حیرت ہے کہ آج مسلمان بھی اس کو ایک انوکھی شے، سمجھ کر اس کے دلدادہ ہو رہے ہیں۔

بخلاف اس کے غیر اسلامی مملکت کی بنیاد ہی غیر اللہ کی فرمانروائی کا اثبات اور اللہ کی فرمانروائی کی نفی پر قائم ہے خلافت الٰہیہ کا تصور انسان کو مالک و مختار نہیں بلکہ اللہ کا نائب اور خلیفہ قرار دیتا ہے۔ اس طرح اس کے مرتبہ کو ایک ترقی یافتہ حیوان سے کہیں بالاتر اور کائنات میں سب سے بلند و برتر قرار دیتا ہے لیکن غیر اسلامی ریاست کی ابتدا ہی اس تخیل سے ہوتی ہے کہ انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے۔

مندرجۂ بالا بنیادی امور ——————— ہر غیر اسلامی ریاست میں مشترک ہیں اس لئے اب درحقیقت اس کی حاجت نہیں ہے کہ ہم سیاست و ریاست کے مختلف نظریات پر علیحدہ علیحدہ بحث کریں لیکن ایسا کرنا مزید وضاحت کا سبب ضرور ہوگا اس لئے ذیل میں ہم ان غیر اسلامی سیاسی نظریات پر علیحدہ علیحدہ بھی تنقیدی نظر ڈالتے ہیں مملکت و ریاست کے قدیم تخیلات پر نظر ڈالنا اس وقت لاحاصل ہے ہم صرف ان نظریات پر بحث کرتے ہیں جو اس وقت موجود ہیں تاہم تنقید کا جو طریقہ ہم نے سطور ذیل میں اختیار کیا ہے اس کی زد ریاست کے ہر غیر اسلامی نظریہ پر پڑتی ہے خواہ وہ اس وقت موجود ہو یا نہ ہو۔

خالص سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مملکت کا جزو اعظم فرمانروا ہے۔ اسی کی تعیین کے اختلاف سے ریاست کے تخیل میں تمیز واقع ہو جاتا ہے اور اسی کے لحاظ سے ریاست کی مختلف قسمیں نکلتی ہیں غیر اللہ کی فرمانروائی کے لحاظ سے جب ہم مملکت و ریاست کی تقسیم کرتے ہیں تو عقلاً دو قسم کی ریاستیں نکلتی ہیں اوّل وہ جن میں شخصی اور انفرادی ارادہ (INDIVIDUAL WILL) کو فرمانروا اور مقتدر اعلیٰ (SOVEREIGN) قرار دیا جاتا ہے۔ دوسری وہ ہیں جن میں اجتماعی ارادہ (GENERAL WILL) کو مقتدر اعلیٰ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اول الذکر کو شخصی ریاست (MONARCHY) کہا جاتا ہے اور ثانی الذکر کی اجتماعی ارادے کے طریق ظہور کے لحاظ سے پھر دو قسمیں ہو جاتی ہیں پہلی قسم یہ ہے کہ اس میں اس ارادہ کا ظہور کسی جماعت کے ذریعہ سے ہو اس کو جمہوریت (DEMOCRACY) کہتے ہیں اور دوسری قسم وہ ہے جس میں اس کا ظہور کسی فرد واحد کے ذریعہ سے ہوتا ہے اس کو آمریت (DICTATERSHIP) کہتے ہیں۔

شخصیت شخصی طرزِ حکومت پر بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس کے معائب سے دنیا بخوبی واقف ہو چکی ہے اور عقلائے عالم میں سے شاید ایک بھی ایسا نہ نکلے جو اس کو پسند کرتا ہو۔ تاہم مختصر بحث خالی از فائدہ نہیں۔

آزادی قانون کا جوہر ہے۔ قانون اگر آزاد نہ ہو تو اس کا صحیح فائدہ نہیں حاصل ہو سکتا۔ قانون سازی اور نفاذ قانون دونوں امور کا ایک شخص کے ہاتھ میں ہونا قانون کی آزادی و غیر جانبداری کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ قانون نافذ کرنے والا جب قانون وضع کرتا ہے تو اس میں اپنے مصالح اور اپنی سہولتوں کا زیادہ لحاظ رکھتا ہے جس سے اکثر اوقات عدل و انصاف کا حصول ناممکن ہو جاتا ہے۔ شخصی حکومتوں میں اس کے نظائر بکثرت دیکھے جا چکے ہیں اور آج بھی جہاں شخصی حکومتیں قائم ہیں وہاں اس کی نظیریں بکثرت ملتی ہیں۔

اس قسم کی حکومتوں میں حکمرانی بے محنت و مشقت اور بلا شرط صلاحیت کار حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لئے بادشاہوں کو اس کی صلاحیت حاصل کرنے کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ عموماً تخت و تاج کے مالک وہ اشخاص ہوتے ہیں جو اس کام کی قطعاً صلاحیت نہیں رکھتے جس کا نتیجہ رعایا کی پریشانی و تباہی کی صورت میں نکلتا ہے۔

رعایا کے اخلاق و نفسیات پر اس طرزِ حکومت کا بہت تباہ کن اثر پڑتا ہے۔ ان میں اپنی طاقت و قوت کا احساس مفقود ہو جاتا ہے۔ غلامانہ اور پست ذہنیت ان کے لئے لازم ہو جاتی ہے۔ ترقی و عروج کی امنگ ختم ہو جاتی ہے۔ خودداری کا جوہر فنا ہو جاتا ہے۔ ذلت و مسکنت کو وہ خوش اخلاقی سمجھنے لگتے ہیں اور حق گوئی، حق پسندی، حمایت حق کے جذبات اُن میں مردہ پڑ جاتے ہیں۔ یہ چیزیں انسان کی ترقی دنیا و آخرت کے لئے جس قدر مضرت رساں ہیں وہ ظاہر ہیں۔

اس نظریہ میں سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس کی کوئی عقلی و اخلاقی بنیاد نہیں ہے۔ سوا طاقت و قوت کے اور کیا چیز ہے جو ایک فرد کے انفرادی ارادے کو ایک جماعت پر مسلط کر دینے کو حق بجانب قرار دے سکتی ہو؟ پھر کیا یہ ظلم نہیں؟ کیا اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حق اور طاقت مرادف الفاظ ہیں؟ اور کیا ان دونوں لفظوں کو مرادف قرار دینا انسان و

انسانیت پر انتہائی مظلم اور عقل و اخلاق سے مکمل بے تعلقی کا ثبوت نہیں ہے ؟ دوسری چیز جو اس احمقانہ نظریہ کی بنیاد ہو سکتی ہے رحم پرستی ہے۔ یہ بنیاد خود جس قدر احمقانہ، جاہلانہ، ظالمانہ اور حیوانی ہے وہ ظاہر ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہی وہ تنکا ہے جس کا سہارا ڈوبتی ہوئی شاہیت اب بھی کبھی کبھی لیتی ہے۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا۔ اس "بادشاہی" کے متعلق ہے جو دین حق کی رہنمائی سے محروم ہو ورنہ اگر اسلامی آئین و قوانین کی پابندی و راہبری کے ساتھ "بادشاہی" قائم ہو تو وہ ان معائب سے پاک ہوگی اور اس کے قیام میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسلامی بادشاہی کا مطلب یہ ہے کہ خلافت اور سربراہی مملکت کو کسی مخصوص خاندان کے ساتھ مخصوص کر دیا جائے اور سربراہ مملکت کا انتخاب پوری قوم میں سے کرنے کے بجائے صرف ایک خاندان سے کیا جائے۔ مگر نظام سلطنت وہی رہے جس کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔

آمریت | زمانہ قدیم کی مطلق العنان بادشاہی اور جمہوریت کے مجموعہ کا نام آمریت ہے۔ اس لئے یہ دونوں کے معائب کی حامل ہے۔ بادشاہی کے معائب کا اقرار تو اب ہر شخص کو ہے اور جمہوریت کے عیوب انشاء اللہ آئندہ سطور میں تحریر کئے جائیں گے۔ حیرت ان مدعیان عقل و دانش پر ہے جو ایک طرف آمریت کے ایسے مہمل نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں اور دوسری طرف اس کے بھی مدعی ہیں کہ ہم انسانیت کی قدر و قیمت پہچانتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر انسانیت کی توہین اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسانوں کی ایک بہت بڑی جماعت خود اپنے ہی ایسے ایک انسان کے ہاتھ میں بالکلیہ اپنی باگیں دے دے۔

چونکہ آمریت عقل و فطرت کے خلاف چیز ہے اس لئے یہ کبھی معمولی حالات میں نہیں پیدا ہوتی بلکہ ان غیر معمولی حالات میں پیدا ہوتی ہے جب کہ مصائب کے کسی شدید حملہ نے کسی قوم کے دماغی توازن کو بگاڑ دیا ہو ایسے موقع پر اگر کوئی ہوشیار آدمی موجود ہوتا ہے تو وہ قوم کی بدحواسی سے فائدہ اٹھا کر عام جذبات میں اشتعال پیدا کرتا ہے۔ امیدوں کے سبز باغ دکھاتا ہے اور اس طرح ان کی توجہات کو اپنے اوپر مرکوز کر کے آمرانہ اقتدار حاصل کر لیتا ہے اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر قوم کے حواس بجا ہو گئے اور اسے سوچنے کی مہلت

مل گئی تو اس کی امارت ختم ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر آمر اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے پیہم ہیجان انگیز کارروائیاں کرتا رہتا ہے تاکہ اس کی قوم کو کبھی سکون قلب کے ساتھ غور و فکر کا موقع ہی نہ ملے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے سب ڈکٹیٹروں کی تاریخ خونریزیوں اور جنگ آزمائیوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کا نتیجہ علاوہ خونریزی بدامنی اور بے اطمینانی کے یہ بھی ہوتا ہے کہ سوسائٹی میں عقل سلیم کا نشوونما رک جاتا ہے اور لوگوں میں اس کی صلاحیت ہی نہیں رہتی کہ معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جماعت کی فکری ہی نہیں بلکہ اخلاقی زندگی بھی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں نظام آمریت میں جماعت کا اخلاق شخصی اخلاق کے تابع ہو کر غصبی ہو جاتا ہے اور اس میں صرف آمر کی زندگی کا نمایاں خلق غالب ہو جاتا ہے حالانکہ قوام تمدن اور مزاج تہذیب کے قیام و بقا کے لئے یہ ضروری ہے کہ مختلف اشخاص کے مختلف اخلاق و اوصاف عالیہ جماعت میں نشوونما پاتے رہیں تاکہ جماعت کا اجتماعی مزاج اعتدال سے بجاوز نہ کر جائے۔ جماعت زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کر سکے اور اس کا کیرکٹر یکطرفہ ہو کر نہ رہ جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آمریت جماعت کو جس سرعت کے ساتھ ایک ناپائیدار ظاہری ترقی کی طرف لے جاتی ہے اس سے وہ چند زیادہ سرعت کے ساتھ وہ اس کو تنزل و ادبار کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ جماعت کے اجتماعی مزاج کو غیر معتدل بنا کر اس کی اخلاقی و فکری بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے اس لئے اس کی ترقی ہی اس کے تنزل و ادبار کا سبب بن جاتی ہے بلکہ درحقیقت اس کی ترقی تنزل بصورت ترقی ہوتی ہے اور اس کا عروج بالکل اس سرخی کی طرح ہوتا ہے۔ جو مریض دق کے چہرے پر نمایاں ہو جاتی ہے اور بیمار دار کو افزائش قوت و تندرستی کا فریب دیتی ہے۔

مزید یہ کہ آمر ہمیشہ ایسے افراد کو ابھرنے سے روکتا رہتا ہے جو اپنی قابلیت کی وجہ سے اس کے مدمقابل ہو سکتے ہوں۔ اس طرح ایک طرف تو افراد میں اپنی فطری قوتوں کو نشوونما دینے کا جذبہ دب جاتا ہے اور دوسری طرف جماعت ایسے اشخاص کی اعلیٰ صلاحیتوں کے فوائد سے محروم رہتی ہے۔ اس کے ماسوا آمر کا عزم اصولی نہیں ہو سکتا بلکہ جذباتی ہوتا ہے۔

اس لئے آمریت میں نظام عدل کا قیام ناممکن ہو جاتا ہے۔

جمہوریت | دنیا کے سیاسی نظریوں میں جس قدر پُر فریب اور پر تلبیس نظریہ جمہوریت ہے اس قدر کوئی بھی نہیں۔ بظاہر یہ ایک جنت ہے جس میں خوف اور حزن کا نام و نشان بھی نہیں جس میں شخصی آزادی کی حفاظت ہوتی ہے۔ جس میں انسانیت کی قدر و قیمت پہچانی جاتی ہے اور جس میں غربت و امارت کا کوئی سوال باقی نہیں رہتا لیکن جب اس کے باطن پر نظر کی جائے تو یہ ایک جہنم نظر آتی ہے جس میں تکالیف اور پریشانیاں بھری پڑی ہیں جس میں انسانیت کو کند چھری سے ذبح کیا جاتا ہے جس میں شخصی آزادی کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور جس میں غریب و کمزور کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ جمہوریت کے سب معائب کو یہاں مفصل طور پر بیان کرنا مشکل بھی ہے اور غیر ضروری بھی۔ چند خرابیاں ذیل میں درج کی جاتی ہیں جن سے اس فردوس نما دوزخ کی حقیقت معلوم کی جا سکتی ہے۔

(۱) جمہوریت کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس میں اجتماعی ارادہ (GENERAL WILL) کی فرمانروائی کو تسلیم کیا جاتا ہے لیکن یہی چیز جمہوریت کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اجتماعی ارادہ کسی مستقل اور پائیدار چیز کا نام نہیں بلکہ ایک بڑی لوچدار چیز ہے جو ہر پر زور چیز سے دباؤ کھا کر اپنی شکل بدل دیتی ہے اس کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔ اس کو لالچ دیا جا سکتا ہے۔ اس کو مشتعل کیا جا سکتا ہے اور اس کو بعض اوقات نہایت معمولی اسباب بھی متغیر کر دیتے ہیں۔ ایسی غیر مستقل چیز پر جس مملکت کی بنیاد رکھی جائے اس میں نہ تو استقلال و پائیداری پائی جا سکتی ہے نہ وہ انسان کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔

(۲) اجتماعی ارادہ کا ادبی، اخلاقی اور نفسیاتی تاثرات سے متاثر ہونا یقینی ہے۔ ایسی حالت میں ریاست کے لئے کوئی مستقل اخلاقی معیار اور قانون کے لئے کوئی پائیدار اخلاقی بنیاد نہیں رہتی۔ اگر جمہور کے اندر برے میلانات نشو و نما پانے لگیں تو مملکت اور قانون دونوں خود جمہور اور ان کے میلانات ہی کے تابع ہو جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ باشندے اگر تباہی کی جانب ایک قدم چلتے ہیں تو ریاست ان کو سو قدم دھکیلتی ہے۔ اس طرح انسانیت کی تباہی و بربادی کا راستہ مختصر ہو جاتا ہے۔ کل کی تاریخ اور آج کا مشاہدہ اس چیز کو واضح

کرنے کے لئے کافی ہے کہ بداخلاقی اور بدکرداری نے جمہوریتوں کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ کس طرح ترقی کی ہے اور جمہوریتوں نے کس طرح ان کو ترقی دینے میں امداد و اعانت کی ہے۔ پھر کس طرح یہ بداخلاقیاں قوموں کی تباہی و بربادی پر منتج ہوئی ہیں۔ واقعہ صرف یہی نہیں کہ جمہوریت اخلاق عامہ کے بگڑ جانے کے بعد ان اخلاق کی اشاعت و اعانت کرتی ہے بلکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ خود جمہوریت اخلاق عامہ کی تباہی و بربادی اور ان کی خرابیوں کو وجود میں لانے کا بہت بڑا سبب ہے اس لئے کہ جمہوریت میں دراصل اخلاق کا کوئی مستقل معیار ہی نہیں رہتا جس کو سامنے رکھ کر جماعت یا افراد میں اخلاقی حس پیدا کی جائے جمہور کی رائے کو اخلاق کا معیار قرار دے کر یہ امید رکھنا کہ جماعت میں اخلاق حسنہ باقی رہیں گے سخت نادانی ہے۔ سوسائٹی کی شرم انسان کو ظاہر اور کھلم کھلا بداخلاقیوں سے کسی نہ کسی حد تک روک سکتی ہے لیکن خلوت میں روکنے سے وہ قطعاً قاصر ہے۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ تخلیہ میں بداخلاقیوں کا ارتکاب جب ایک معتدبہ جماعت کرتی ہے تو رفتہ رفتہ بقیہ جماعت بھی اس سے متاثر ہوتی ہے اور مخالفین کی قوت خود بخود کمزور ہو جاتی ہے۔ آخر کار جمہور کے نزدیک بھی اس فعل میں کوئی شناعت باقی نہیں رہتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بداخلاقی خوش اخلاقی بن کر ریاست کی اعانت و امداد حاصل کر لیتی ہے اور اس کے زیر سایہ پھل پھول کر دوسرے معائب و خبائث کو پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔

(۳) جماعتی تعصب اور گروہ بندی جمہوریت کے لئے ایک لازم اور ضروری چیز ہے اس مہلک مرض کا اثر یہ ہوتا ہے کہ حق گوئی و حق پسندی کا وصف لوگوں میں بالکل مفقود ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں قوم کی اخلاقی تباہی یقینی ہے۔ پھر یہی چیز جماعتی استیلاء اور اکثریت کے ظلم پر منتج ہوتی ہے جو جمہوریت کی بدترین خصوصیت ہے۔

(۴) قانون سازی کے اختیارات جمہوریتوں میں درحقیقت صرف برسر اقتدار جماعت کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اگرچہ بظاہر ریاست کی سب جماعتیں قانون سازی میں حصہ لیتی ہیں۔ پھر اس مقتدر جماعت میں بھی جماعتی نظم کا دہانہ ہر ایک کے منہ پر چڑھا ہوتا ہے جس کی وجہ سے حق کا دم ان کے حلق میں گھٹ کر نکل جاتا ہے۔ اس میں اور آمریت میں کچھ فرق نہیں

باقی رہتا اور جمہور کا نام محض ایک فریب اور دھوکہ ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ برسراقتدار جماعت آخر انسانوں کی جماعت ہوتی ہے، فرشتوں کی جماعت نہیں ہوتی۔ اس کے وضع کئے ہوئے قوانین پر اس کے ذاتی رجحانات و تعصبات کا اثر پڑنا لازم ہے۔ ایسی صورت میں عدل و انصاف کا معیار اس جماعت کے مفاد کے علاوہ کچھ نہیں رہ جاتا۔ پھر یہ معیار بھی قطعاً غیر مستقل ہوتا ہے۔ جب دوسری پارٹی برسراقتدار ہوتی ہے تو معیار اور نقطۂ نظر تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں شہریوں اور سیاست دونوں کو "امن و عیش" کہاں نصیب ہو سکتا ہے جب کہ ہر وقت "جرس" "ربندید محملہا" کی آواز بلند کر رہا ہو۔

طاقت ور اور برسراقتدار جماعت حزب مخالف کو ہر ممکن طریقہ سے دبانے کی کوشش کرتی رہتی ہے اور اس کا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ مخالف پارٹی بھی اول الذکر کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتی ہے۔ اس وجہ سے جمہوریتوں میں باہمی تفرقہ کی آگ برابر سلگتی رہتی ہے اور اس کا خانہ جنگی اور دیگر مہلک نتائج کی طرف منجر ہونا بعید نہیں ہوتا۔

(۶) اجتماعی ارادہ چونکہ ایک تغیر پذیر شے ہے اس لئے جمہوریتیں کبھی مستقل اور پائیدار اصول پر نہیں چلتیں بلکہ ان میں تمول اور ابن الوقتی کی شان پائی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ دوست ان پر اعتماد کر سکتے ہیں نہ دشمن۔ ان کے ساتھ معاملہ کرتے وقت کوئی بھی یہ بھروسہ نہیں کر سکتا کہ آج ان کی جو پالیسی ہے کل بھی وہی قائم رہے گی۔

(۷) اگر جمہوریت نظام سرمایہ داری کے ساتھ مخلوط ہو تو یہ ناگزیر ہے کہ حکومت و فرمانروائی صرف سرمایہ دار طبقہ کے قبضہ میں آجائے اور غربا کی قسمت میں ابدی محکومی اور غلامی لکھ دی جائے کیونکہ جمہوریت میں اقتدار اس جماعت کو حاصل ہوتا ہے جس کے پاس پروپیگنڈے کے ذرائع زیادہ ہوں اور ظاہر ہے کہ یہ چیز دولت مندوں کو غریبوں کی بہ نسبت زیادہ میسر ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے چنانچہ مشاہدہ ہمارے اس بیان کی تائید کر رہا ہے۔ انگلستان میں جو جمہوریت کی محبت میں درجۂ جنون سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ محض سرمایہ دار طبقہ کی فرمانروائی ہے۔ یہی حال امریکہ ہندوستان اور دوسرے جمہوری ممالک کا ہے۔

(۸) ہر غیر اسلامی نظریۂ سیاسی خصوصاً جمہوریت کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ اس کے اوپر جس ریاست کی بنیاد رکھی جائے اس کی پالیسی کا محور صرف معاشیات کو بنانا پڑتا ہے۔ یہ ایک لازم اور ضروری چیز ہے جس سے کسی جمہوریت کو مفر نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اجتماعی ارادہ جو جمہوری ریاستوں کا طاغوت مسجود ہے۔ انفرادی ارادوں کے اجتماع سے وجود میں آتا ہے اور انفرادی ارادے جب خدا کی بندگی سے آزاد ہوں تو ان کا منتہائے مقصود صرف مطالبات نفس و بدن کو پورا کرنا ہوتا ہے جو معاشیات کا سرچشمہ ہے اس لئے ہر جمہوریت اس پر مجبور ہے کہ وہ معاش مسائل کو اولیت اور اولویت کا درجہ دے اور دوسرے مسائل کو صرف ان کے تابع سمجھے، زندگی کے ہر شعبہ کو معاشیات کے تابع کر دینے کا لابدی نتیجہ وہ حیوانیت و بہیمیت ہے جس کا مشاہدہ آج دنیا کے اکثر حصہ میں ہو رہا ہے اخلاقی حس کی موت خدا سے بے نیازی بلکہ بے زاری، مادہ پرستی کا غلبہ، یہ سب چیزیں اسی شکم پرستی اور عبدیت حرص و ہوس کے ضروری اور لابدی نتائج ہیں جن سے نجات اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ جمہوریت کا وجود دنیا میں باقی ہے اور جب تک معاشیات کے بت کی پرستش اس عالم میں جاری ہے۔ مشہور ملحد جوزف اسٹالن نے بالکل سچ کہا ہے کہ "لوگوں کو مذہب و روحانیت سے بیگانہ اور متنفر بنانے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ان کو معاشیات کی جانب زیادہ سے زیادہ متوجہ کر دیا جائے۔"

معاشیات کے غلبہ کا دوسرا ضروری اور لابدی اثر یہ ہوتا ہے کہ جمہوریت کے ساتھ سرمایہ داری کا ناقابل انقطاع رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں ہر جگہ نظام سرمایہ داری اور نظام جمہوری ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ یہ قطعاً ناممکن ہے کہ کسی ملک میں نظام سیاسی جمہوری ہو اور نظام معاشی سرمایہ داری کے علاوہ کچھ اور ہو اس لئے کہ جمہوریت کے معاملہ میں ذیل کی دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت بہرحال ہوگی۔

اول یہ کہ جمہوریت کے قیام سے پیشتر نظام سرمایہ داری موجود ہو۔ اس صورت میں یہ یقینی ہے کہ برسر اقتدار جماعت یا تو خود سرمایہ دار ہوگی یا کم از کم سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح ہوگی۔ اور مشاہدہ بھی اس کی

تائید کرتا ہے۔ چنانچہ انگلستان کے جمہوری نظام میں بینک آف انگلینڈ کے ڈائرکٹر اور وزیر اعظم انگلستان کی پوزیشن بالکل یکساں ہے بلکہ دستوری قانون کے ماہرین کی ایک بہت بڑی جماعت ڈائرکٹر کے عہدے کو وزیر اعظم کے عہدے سے اہم تر خیال کرتی ہے۔ اسی طرح فرانس کے بینک کا ڈائرکٹر فرانسیسی حکومت پر اس طرح حاوی رہتا ہے کہ حکومت اس کے اشارۂ چشم و ابر کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ حکومت اگر اس سے نہیں نباہ سکتی تو اس کو مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ فرانسیسی تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ فرانسیسی کابینہ حکومت میں روز روز کے تغیرات و انقلابات کس حد تک اسی بینک کے رہین منت رہتے ہیں۔ امریکہ میں حکومت پر یہود اپنے تمول کی وجہ سے باوجود اقلیت میں ہونے کے چھائے ہوئے ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جمہوریت کے قیام کے وقت نظام معاشی سرمایہ دارانہ نہ ہو بلکہ کوئی اور مثلاً اشتراکی ہو۔ ایسی صورت میں یہ لازم ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد نظام معاشی رفتہ رفتہ متغیر ہو کر سرمایہ دارانہ ہو جائے۔ اس لئے کہ اس صورت میں جو جماعت بھی جمہوریت میں برسر اقتدار ہوگی وہ سرمایہ پر پورا قبضہ رکھے گی اور اس میں ایسے تصرفات کرے گی جو اس کے مفاد کے مناسب ہوں اگر شخصی سرمایہ داری نہ بھی ہو تو جماعتی سرمایہ داری تو یقینی ہے جو شخصی سرمایہ داری سے بھی زیادہ مضر ہے۔

اس خالص معاشی ریاست و سیاست کے تباہ کن اثرات کا احاطہ مشکل ہے۔ اس سے جو اخلاقی بربادی ہوئی ہے وہ بیان سے باہر ہے لیکن اس کا ایک نتیجہ عجیب و غریب ہوتا ہے جس کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا یعنی یہ خود اس جمہوری مملکت کو بھی خطرے میں مبتلا کر دیتی ہے جو اس کو وجود عطا کرتی ہے۔ قارونیت کا غلبہ انسان سے انسانیت کا جوہر سلب کر لیتا ہے۔ ایک سرمایہ دار کو صرف سرمایہ عزیز ہوتا ہے نہ اس کو قوم کی پروا ہوتی ہے نہ ملک نہ جماعت کی۔ وطنیت و قومیت کے وہ تصورات جن پر عموماً جمہوریت کی بنیاد قائم ہوتی ہے سرمایہ دار کے ذہن سے قطعاً محو ہو جاتے ہیں اور وہ ہر اس چیز کی اعانت و امداد کرتا ہے جس سے اس کے سرمایہ کی ترقی و حفاظت ہوتی ہو خواہ اس

کے نتیجہ میں مملکت، ملک، قوم سب تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ انگلستان کا مشہور اہل قلم جان گنتھر اپنی کتاب "باطن یورپ" INSIDE EUROPE میں لکھتا ہے۔

" فرانسیسی سپاہی کے سینہ میں جرمنی کی جانب سے جو گولی آکر لگی ہے بہت ممکن ہے کہ فرانس ہی کے کسی کارخانہ کی بنی ہوئی ہو۔"

(۹) اجتماع کے وجود میں آنے کے دو سبب ہوتے ہیں۔ کوئی عقلی اصول جو پوری جماعت کا مقصد و مطمح نظر ہو جائے اور مقصد و عقیدے کی ہم آہنگی جس کو وحدت کلمہ بھی کہتے ہیں پوری جماعت کو مجتمع کر دے یا کوئی خاص جذبہ جو افراد میں ہم آہنگی پیدا کر کے ان میں ایک ہیئت اجتماعیہ پیدا کرے۔ جمہوری ریاست میں چونکہ اصول کا معیار خود اجتماع ہے۔ اس لئے اس کے سامنے کوئی ایسا مستقل عقلی اصول و قانون نہیں ہوتا جو افراد میں ہیئت اجتماعیہ پیدا کر کے جمہوریت کے وجود میں آنے کا سبب بنے۔ لہٰذا یہ لازم ہے کہ اس میں اجتماع کی بنیاد عقلی کے بجائے محض جذباتی ہو جس کے مندرجہ ذیل نتائج یقینی ہیں۔

الف: جماعت میں عقلیت کے بجائے جذباتیت پیدا ہو جاتی ہے جس سے اس کے قوائے عقلیہ روز بروز کمزور ہوتے جاتے ہیں، نہ اس کا فکری نظام صحیح رہتا ہے نہ اخلاق اور رفتہ رفتہ وہ حیوانیت اور بہیمیت کے درجہ پر پہنچ جاتی ہے۔

ب: جذبات میں استقلال نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ اجتماع بھی سخت متلون اور سیماب روش ہوتا ہے۔

(۱۰) جمہوریت میں ایک جماعت محض اس بناء پر دوسری جماعت پر صاحب اقتدار بنائی جاتی ہے کہ وہ ثانی الذکر سے تعداد میں زیادہ ہے۔ یہ چیز جس قدر عدل و انصاف کے خلاف ہے وہ ظاہر ہے۔ عقل سلیم کسی صورت سے بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہو سکتی کہ محض تعداد کی اکثریت حکمرانی اور فرمانروائی کا حق پیدا کر دیتی ہے بلکہ اس کے ساتھ ان شرائط کا تقاضا کرتی ہے جو اسلام نے لگائے ہیں۔

فتلك عشرة كاملة

مشتے نمونہ از خروارے صرف ان دس معائب کے اظہار پر اکتفا کرتا ہوں۔ جمہوریت کی

بقیہ صفحہ ۶ پر